سورۃ البقرۃ

آیت : ۶۱

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحث اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲ : ۵ : ۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲ : ۵ : ۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲ : ۳۹ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّاۗىِٕهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۭ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ ۭ اِھْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۭ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ

© rasailojaraid.com

الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝

۲ : ۳۹ : ۱ اللغة

[وَاِذْ] میں "وَ" مستانفہ ہے اس کے معانی و استعمالات کے لیے چاہیں تو البقرہ: ۸ ۔۔۔ [۲ : ۷ : ۱ (۱)] دیکھ لیجئے اور "اِذْ" ظرفیہ بمعنی "جب/جس وقت" ہے اس کے طریق استعمال کے لیے دیکھئے البقرہ: ۳۰ [۲ : ۲۲ : ۱ (۱)] اور یہ پوری ترکیب "وَاِذْ" (اور جب) اس سے پہلے کئی دفعہ گزر چکی ہے۔

[قُلْتُمْ] کا مادہ "ق و ل" اور وزن اصلی "فَعَلْتُمْ" ہے۔ اس کی اصلی شکل "قَوَلْتُمْ" تھی۔ اس میں واقع ہونے والی تعلیل وغیرہ (یعنی قَوَلْتُمْ ۔ قَالْتُمْ ۔ قَلْتُمْ ۔ قُلْتُمْ) پر البقرہ: ۵۵ [۲ : ۳۹ : ۱ (۱)] میں بات ہوئی تھی۔ اور مادہ (قول) سے فعل مجرد کے معنی و استعمال پر بحث البقرہ: ۸ [۲ : ۷ : ۱ (۴)] میں ہوئی تھی۔ لفظ "قُلْتُمْ" اس فعل مجرد (قال یقول = کہنا) سے فعل ماضی صیغہ جمع مذکر حاضر ہے اس کا ترجمہ ہے "تم نے کہا" مگر اس کے شروع میں "وَاِذْ" (اور جب) آ جانے کی وجہ سے اس کا ترجمہ "تم نے کہا تھا" ہو سکتا ہے۔

[یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ] میں ابتدائی "یا" ندا کے لیے ہے اور یوں "یاموسی" (برسم املائی) کا ترجمہ ہے "اے موسیٰ (علیہ السلام)" "لَنْ نَّصْبِرَ" کا مادہ "ص ب ر" اور وزن "لَنْ نَفْعِلَ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد (صَبَرَ یَصْبِرُ = صبر کرنا) کے معنی باب اور استعمال وغیرہ پر تفصیلی بحث البقرہ: ۴۵ ۔۔۔ [۲ : ۳۷ : ۱ (۱)] میں گزر چکی ہے۔

"لَنْ نَّصْبِرَ" اس فعل مجرد سے فعل مضارع منفی بِلَنْ کا صیغہ جمع متکلم ہے جس میں ضمیر الفاعلین "نحن" مستتر ہے۔ فعل مضارع کی اس قسم کی نفی (بِلَنْ) سے اس (مضارع) کی صورت اور معنی پر جو اثر پڑتا ہے اس کے متعلق البقرہ: ۲۴ [۲ : ۱۷ : ۱ (۱۲)] میں بات ہو چکی ہے۔

© rasailojaraid.com

اس کے مطابق یہاں "لن نصبر" کا ترجمہ بنتا ہے "ہم ہرگز صبر نہ کریں گے"۔ چنانچہ بعض مترجمین نے یہی ترجمہ رہنے دیا ہے۔ بعض حضرات نے "صبر" کے اصل بنیادی معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے "ہم ہرگز نہ ٹھیریں گے" اور "ہم کبھی نہ رہیں گے" سے ترجمہ کیا ہے۔ بعض نے اردو محاورے کا خیال کرتے ہوئے "ہم سے نہیں رہا جاتا"، "ہم سے ہرگز صبر نہ ہوگا"، "ہم سے کبھی صبر نہ ہو سکے گا"، "ہم سے صبر نہیں ہو سکتا" اور "ہم بس نہیں کر سکتے" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے۔ سب کا مفہوم ایک ہی ہے اور مضارع میں منفی کے زور (اور زمانہ مستقبل کے مفہوم) کو "نہیں کر سکتے، نہیں ہو سکتا، نہیں ہو سکے گا" وغیرہ سے ظاہر کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں اس فعل مجرد (صبر یصبر) سے افعال کے مختلف صیغے ۵۵ سے زیادہ جگہ آئے ہیں۔

۲:۶۱:۱ (۱) [عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ] - اس میں "علی" کا تعلق تو سابقہ فعل (لن نصبر) کے ساتھ اس کے صلہ کے طور پر ہے

(صبر علی ...... پر صبر کرنا) دیکھئے [۲:۴۷:۱ (۱)]

لفظ "طعام" (جو یہاں مجرور بالجر ہے) کا مادہ "ط ع م" اور وزن "فَعَال" ہے اس مادہ سے فعل مجرد "طعِم ... یطعَم طعامًا وطَعْمًا" (باب سمع سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں ... "(کھانے کی کسی چیز) کو کھانا، کھا لینا" اور کبھی یہ فعل صرف "چکھنا" کے معنی میں آتا ہے اور کبھی صرف "پینا" کے معنی بھی دیتا ہے مثلاً البقرہ: ۲۴۹ میں اس کے دونوں معنی لیے جا سکتے ہیں یعنی "چکھنا اور پینا"۔ اور المائدہ: ۹۳ میں یہ فعل "کھانا اور پینا" دونوں معنی کے لیے آیا ہے۔ مذکورہ آیات پر بحث اپنی اپنی جگہ آئے گی۔

● یہ فعل (طعِم یطعَم) متعدی ہے اور اس کا مفعول بنفسہ (بغیر صلہ کے) آتا ہے جیسے "یطعمہ" (الانعام: ۱۴۵) میں اور "لا یطعمُھا" (الانعام: ۱۲۸) میں ضمیر منصوب ساتھ آئی ہے۔ البتہ بعض دفعہ اس کا مفعول محذوف (غیر مذکور) ہوتا ہے جیسے "فاذا طَعِمتم" "جب تم کھا چکو" (الاحزاب: ۵۳) میں ہے۔

قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے مختلف صیغے کل پانچ جگہ آئے ہیں۔ مزید فیہ کے باب افعال سے صیغے ۱۲ جگہ اور باب استفعال سے صرف ایک ہی صیغہ فعل الکہف: ۷۷ میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ مجرد و مزید سے مختلف مصادر اور مشتقات ۳۰ کے قریب مقامات پر آئے ہیں۔

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

● زیر مطالعہ لفظ (طَعام) جو فعل مجرد کا مصدر ہے، بمعنی اسم مفعول بھی استعمال ہوتا ہے یعنی "کھائی جانے والی چیز" (جیسے لفظ "شراب" عربی میں کسی بھی پی جانے والی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے) بعض دفعہ اس لفظ (طعام) کا اطلاق صرف "گندم" پر بھی ہوتا ہے اور بعض دفعہ "طعام" اجناس خوردنی" پر۔ اور قرآن کریم میں بعض جگہ یہ لفظ "گوشت" کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ دراصل عبارت کا سیاق و سباق اس کے معنی متعین کرتا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ "کھانا" (یعنی کھانے کی چیز) ہی کیا جاسکتا ہے۔ ویسے لفظ "طعام" بھی اردو میں مستعمل ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ مفرد و مرکب مختلف صورتوں میں ۴۸ جگہ آیا ہے اور زیادہ تر "مطلق "کھانا" اور "خوراک" کے معنی میں ہی آیا ہے۔

۲:۳۹:۱(۲) [واحد] جو مندرجہ بالا مرکب جاری "علی طعام واحد" [**۲:۳۹:۱(۱)**] کا دوسرا حصہ ہے۔ اس لفظ (واحد) کا مادہ "و ح د" اور وزن "فاعِلٌ" ہے۔

اس مادہ سے فعل مجرد "وَحَدَ یَحِدُ" (دراصل یَوحِد) وَحْدۃً (باب ضرب سے) بھی آتا ہے اور "وحِد یحِد" (باب حسِب سے) بھی۔ اور بعض دفعہ "وحُد یحِد" (یعنی ماضی باب کرُم سے اور مضارع باب حسِب یا ضرب سے) بھی استعمال ہوتا ہے [اس طرح کے دو غلے باب صَرف کی عام کتابوں میں مذکور نہیں ہوتے۔ ویسے یہ ہوتے بھی بہت شاذ ہیں] اور ان تمام صورتوں میں اس فعل کے معنی "ایک ہونا" "اکیلا ہونا یا رہ جانا" ہوتے ہیں۔ اس فعل کے آخری (کرُم والے) استعمال سے ہی صفت مشبہ "وحید" بنتی ہے۔ اور عام عربی میں تو اس مادہ (وحد) سے مزید فیہ کے ابواب تفعیل، تفعّل، افعال اور افتعال سے بھی افعال استعمال ہوتے ہیں بلکہ اسی سے باب تفعیل کا مصدر "توحید" اور باب افتعال کا مصدر "اتحاد" اپنے اصل عربی معنی کے ساتھ اردو میں بھی مستعمل ہیں۔ تاہم قرآنِ کریم میں اس مادہ سے فعل مجرد یا مزید فیہ سے کسی قسم کا کوئی فعل کہیں استعمال نہیں ہوا۔ البتہ اس سے ماخوذ بعض مصادر اور اسماء (واحد، واحدۃ، وحدَہ اور وحید) ۶۰ کے قریب مقامات پر آئے ہیں۔

● لفظ "واحد" اس مادہ کے فعل مجرد سے اسم الفاعل (بمعنی ایک یا اکیلا ہونے یا ہو جانے والا) ہے اس کا عام اردو ترجمہ "ایک" ہی کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ گنتی کا پہلا عدد بھی ہے یعنی مذکر کے لیے کہتے ہیں "واحد، اثنان، ثلاثۃ... الخ اور مؤنث کے لیے "واحدۃ، اثنتان، ثلاث، ...الخ" کہتے ہیں۔ کسی شخص یا چیز کی گنتی کے وقت عدد دراصل تین سے لگتا ہے۔ "ایک" کے لیے

© rasailojaraid.com

ویسے واحد (مفرد) کا لفظ خصوصاً نکرہ کا استعمال کافی ہے مثلاً "کتاب" کا مطلب ہی ہے "ایک کتاب"۔ دو کے لیے تثنیہ کا لفظ کام دیتا ہے جیسے کِتَابَانِ یا کِتَابَیْنِ = دو کتابیں۔ البتہ تین کتابوں کے لیے "ثلاثۃ کتب" کہیں گے۔ ایک یا دو کی گنتی ظاہر کرنے کے لیے معدود سے پہلے کوئی عدد نہیں لگتا۔

● البتہ "واحد" (یا "واحدۃ" برائے مؤنث) اور "اثنان" (یا "اثنتانِ" برائے مؤنث) بطور صفت کسی چیز کے بعد آتے ہیں۔ مثلاً کہہ سکتے ہیں "رجل واحدٌ" (یا امرأۃ واحدۃ) اسی طرح "رجلانِ اثنانِ" (یا امرأتانِ اثنتان)۔ اس قسم کی ترکیب میں اردو ترجمہ "ہی" کے ساتھ کرنا چاہیے یعنی "ایک ہی مرد، ایک ہی عورت، دو ہی مرد، دو ہی عورتیں" وغیرہ۔ قرآن کریم میں لفظ "واحد" کے بطور صفت آنے کی متعدد مثالیں موجود ہیں جیسے "اِلٰہ واحد" "باب واحد" "ماء واحد" وغیرہ۔ ان سب کا اردو ترجمہ "ایک ہی ...." کے ساتھ ہوگا۔ (ایک ہی معبود، ایک ہی دروازہ، ایک ہی پانی)۔ یہ نکتہ ذہن میں رکھیے گا آگے چل کر اس قسم کی تراکیب کو سمجھنے میں مدد ملے گی جیسے یہاں "طعام واحد" آیا ہے۔ "واحد" معرف باللام "الواحد" جب مطلق استعمال ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ایک اسم ہے اپنے اس مخصوص معنی اور استعمال کے ساتھ یہ لفظ (الواحد) قرآن کریم میں ۶ جگہ آیا ہے۔

● مندرجہ بالا وضاحت کے مطابق اس پوری ترکیب "علی طعامٍ واحدٍ" کا ترجمہ بنتا ہے "ایک ہی کھانے پر" جسے بامحاورہ کرنے کے لیے "ایک ہی طرح کے کھانے پر"، "ایک ہی قسم کے کھانے پر" کی صورت میں ترجمہ کیا گیا ہے بعض نے "ایک کھانے پر" کے ساتھ بھی ترجمہ کیا ہے جو لفظ سے تو قریب ہے مگر اس میں "واحد" کے اسم صفت والے مفہوم کا زور نہیں ہے۔

[فَادْعُ لَنَا] جو دراصل "فَ" (پس، اس لیے) + "اُدْعُ" (جس پر ابھی بات ہوگی) + "لِ" (لام الجر بمعنی ... کے لیے) + "نا" (ہمارے) کا مرکب ہے۔ اس میں کلمہ "اُدْعُ" سے پہلے فاء عاطفہ (فَ) کے آجانے کی وجہ سے ابتدائی ہمزۃ الوصل تلفظ سے ساقط ہو جاتا ہے اور "فَادْعُ" پڑھا جاتا ہے۔

● اس لفظ "اُدْعُ" کا مادہ "د ع و" اور وزن اصلی "اُفْعُلْ" ہے اس کی اصلی شکل "اُدْعُوْ" تھی جس میں فعل کے مجزوم ہونے کی بناء پر آخری "و" کتابت اور تلفظ دونوں سے ساقط ہو جاتی ہے

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

(تمام ناقص افعال میں مجزوم ہونے کی صورت میں آخری "و" یا "ی" ۔ لام کلمہ ۔ کو گرا دیا جاتا ہے) اور باقی "اُدْعُ" رہ جاتا ہے۔

اس مادہ سے فعل مجرد "دعا یدعو دعاءً" (پکارنا، دعا کرنا) کے معنی اور استعمال پر البقرہ: ۲۳ [۲:۱۷:۱(۷)] میں مفصل بات ہوئی تھی۔

● "اُدْعُ" اس فعل مجرد سے فعل امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر ہے۔ اس سے فعل امر کی گردان یوں ہوتی ہے۔ "اُدْعُ، اُدْعُوَا، اُدْعُوْا، اُدْعِیْ، اُدْعُوَا اور اُدْعُوْنَ"۔ اس فعل کے ساتھ اگر لام (لِ) کا صلہ آئے تو اس کے معنی "... کے لیے (اچھی) دعا مانگنا" ہوتے ہیں اور اگر "علیٰ" کا صلہ آئے تو اس کے معنی "... کو بددعا دینا" ہوتے ہیں۔ مثلاً کہیں گے "دَعَا لَہٗ" = اس نے اس کے لیے دعا مانگی اور "دعا علیہ" = اس نے اس کو بددعا دی۔

● یہاں زیر مطالعہ آیت میں "فادع لنا" کا مطلب ہوگا "پس تو ہمارے لیے دعا کر/ دعا مانگ"۔ بعض نے زیادہ لفظی ترجمہ یعنی "پکار ہمارے واسطے" کی صورت میں کیا ہے۔ بعض نے احتراماً "تو" کی بجائے "آپ" کے ساتھ یعنی "آپ ہمارے لیے دعا کیجئے، ہمارے واسطے دعا کریں" سے ترجمہ کیا ہے۔ جبکہ بعض نے "لنا" کا ترجمہ نظر انداز کرتے ہوئے صرف "آپ دعا کیجئے، دعا کیجئے، دعا کر" کے ساتھ ترجمہ کر دیا ہے جو بہرحال اصل نص (الفاظ عبارت) سے قدرے ہٹ کر لہٰذا محل نظر ہے۔

[رَبَّكَ] جو "ربَّ + كَ" ہے یعنی "اپنے رب کو، اپنے پروردگار کو"۔ یہ "کو" والا ترجمہ (جیسا کہ آگے "الاعراب" میں بیان ہوگا) کلمہ "رب" کے یہاں مفعول واقع ہونے کی بنا پر ہے۔ اگر "ادع" (سابقہ فعل امر) کا ترجمہ لفظی "تو پکار" کیا جائے تو "ربّك" کا ترجمہ "اپنے رب کو" ہی مناسب ہے اور اگر "ادع" کا ترجمہ "دعا کر، دعا مانگ" سے کیا جائے تو "ربك" کا ترجمہ "اپنے رب سے، اپنے مالک سے، اپنے پروردگار سے" ہی کیا جائے گا۔ یاد رہے "اس نے اپنے رب سے دعا مانگی/ کی" کا عربی ترجمہ "دعا ربّہ" ہوگا۔ عربی میں ایسے موقع پر "مِن" کا استعمال (یعنی "دعا من ربّہ" کہنا) بالکل غلط ہوگا۔

لفظ "رب" کے مادہ، فعل، باب اور معنی و استعمال پر الفاتحہ: ۲ [۱:۲:۱(۳)] میں بات ہوئی تھی۔

[یُخْرِجْ لَنَا] کے "یُخْرِجْ" کا مادہ "خ ر ج" اور وزن "یُفْعِلُ" ہے یعنی یہ اس مادہ سے

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

باب اِفعال کا فعل مضارع مجزوم صیغہ واحد مذکر غائب ہے ("جزم" کی وجہ پر "الاعراب" میں بات ہوگی) اس مادہ سے فعل مجرد (خرج یخرُج) کے باب و معنی کے علاوہ اس سے باب اِفعال کے فعل (اَخرج یُخرج = نکالنا) کے معنی و استعمال کی بھی اس سے پہلے البقرہ: ۲۲ [۲:۱۶:۱(۱۱)] پر وضاحت کی جاچکی ہے۔ "لَنَا" بمعنی "ہمارے لیے، ہمارے واسطے" ابھی اوپر گزرا ہے۔

● اس طرح زیر مطالعہ عبارت "یُخرِج لنا" کا ترجمہ بنتا ہے "کہ وہ نکال دے ہمارے لیے"۔ بیشتر مترجمین نے یہاں "یُخرج" کی ضمیر فاعل (وہ) کا ترجمہ نظر انداز کر دیا ہے یعنی "کہ نکالے ہمارے لیے، ہمارے لیے نکالے" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے جسے صرف اردو محاورے کی بنا پر درست کہا جاسکتا ہے بعض نے "نکالے" کی بجائے "پیدا کرے" سے ترجمہ کیا ہے جو بلحاظ مفہوم ہی درست ہے۔ بعض [illegible] (یُخرج لنا) کا ترجمہ ہی نظر انداز کر دیا ہے اور "دعا کر دیجئے ان چیزوں کی جو . . . " سے ترجمہ کر دیا ہے۔ یہ ترجمہ عیب سے خالی نہیں ہے۔

[مِمَّا] جو مِنْ + مَا ہے یعنی "اس میں سے جو کہ" (اگر "مِن" تبعیض کے لیے ہو تو) یا "اس قسم کی (چیزیں) جو کہ" (اگر "مِن" بیانیہ سمجھا جائے تو)۔ یہاں بھی بیشتر مترجمین نے غالباً اردو محاورے کے لیے "مِن" کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف "جو" یا "جو چیزیں" سے ترجمہ کیا ہے البتہ بعض نے "ایسی چیزیں جو کہ" سے ترجمہ کیا ہے۔ یہ "مِن" بیانیہ سمجھنے کی صورت میں درست ترجمہ ہے۔ "مِمَّا" کے دونوں اجزاء "مِن" اور "ما" پر البقرہ: ۳ [۲:۲:۱(۵)] میں بالتفصیل بات ہوئی تھی۔

۲:۳۹:۱(۳) [تُنْبِتُ الْاَرْضُ] یہ ایک پورا جملہ فعلیہ ہے جس کے ابتدائی فعل "تُنْبِتُ" کا مادہ "ن ب ت" اور وزن "تُفْعِلُ" ہے اس مادہ سے فعل مجرد "نَبَت یَنبُت نباتًا" (نصر سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی "اُگنا" ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں "نبت البَقْلُ" (سبزی اُگی یعنی زمین سے نکل آئی) پھر اس سے اس فعل میں "ظاہر ہونا، نمودار ہونا، نمایاں ہونا اور نشوونما پانا" کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ زیادہ تر تو یہ فعل لازم ہی استعمال ہوتا ہے البتہ بعض دفعہ (اگر زمین کو اس کا فاعل بنا دیا جائے تو) یہ بطور فعل متعدی بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں "نبتتِ الارضُ" یعنی زمین نے نباتات اگائی" یا "زمین نباتات والی ہوگئی" (بطور فعل لازم)۔ قرآن کریم میں اس فعل مجرد کا صرف ایک صیغہ ایک ہی جگہ (المؤمنون: ۲۰) آیا ہے۔ اور مزید فیہ کے صرف باب افعال سے فعل کے مختلف صیغے ۱۶ جگہ آئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے فعل مجرد کا مصدر "نبات" بمعنی

© rasailojaraid.com

"نابت" (اسم الفاعل) یعنی "اگنے والی شے، روئیدگی، نباتات" ۹ جگہ آیا ہے۔

● زیر مطالعہ لفظ "تُنبِتُ" اس مادہ سے باب افعال کا فعل مضارع صیغہ واحد مؤنث غائب ہے۔ اس باب (اِفعال) سے فعل "اَنبت ... یُنبِتُ اِنباتًا" کے بنیادی معنی ... "کو اگانا" ہیں یعنی یہ فعل متعدی ہے اور اس کا فاعل "الارض" (زمین) بھی آسکتی ہے اور اللہ تعالیٰ بھی۔ مثلاً کہیں گے "انبتت الارضُ" (زمین نے نباتات اگائی یا نکالی) اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں ـ "انبتَ اللّٰہُ البقلَ" (اللہ نے سبزی اگائی)۔ مگر اس باب کے اسم مفعول کے لیے "مُنبَت" کی بجائے "مَنبُوت" (مجرد سے اسم مفعول) استعمال ہوتا ہے جس طرح فعل "اَحبّ" (باب اِفعال) سے اسم مفعول "محبوب" استعمال ہوتا ہے حالانکہ اسم مفعول کا یہ وزن فعل مجرد کے لیے ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں اس باب (اِفعال) سے آنے والے افعال میں گیارہ جگہ فاعل کے طور پر اللہ تعالیٰ یا اس کے لیے کسی ضمیر کا ذکر ہے اور صرف چار جگہ بطور فاعل "زمین" یا اس کے لیے کوئی ضمیر آئی ہے۔ زیر مطالعہ جملہ "تنبت الارض" کا دوسرا حصہ (الارض) یہاں بطور فاعل مذکور ہوا ہے۔ لفظ "الارض" (زمین) کے مادہ، معنی اور استعمال وغیرہ پر البقرہ: ۱۱ [۲:۹:۱(۴)] میں بات ہو چکی ہے۔

● اس طرح اس جملے (تُنبت الارضُ) کا ترجمہ تو بنتا ہے "زمین اگاتی ہے" اور محتاط مترجمین نے تو یہی ترجمہ کیا ہے۔ بعض نے "زمین کی اگائی چیزیں" اور بعض نے "زمین کی پیداوار" سے ترجمہ کیا ہے جسے بلحاظ مفہوم و محاورہ درست کہہ سکتے ہیں۔ مگر بہت سے حضرات نے اس کا ترجمہ "اگتا ہے زمین سے، زمین سے اگتی ہے، زمین سے اگا کرتی ہے" کی صورت میں کیا ہے اسے صرف مفہوم کے لحاظ سے ہی درست کہیں تو کہیں ورنہ فعل متعدی کا ترجمہ فعل لازم کی طرح کرنے کی کوئی مجبوری تو نہیں تھی۔

۲:۲۹:۱(۴) [مِنْ بَقْلِهَا] یہ "مِن" ("میں سے" یا "از قسم") + بَقْل (جس پر ابھی بات ہوگی) + ھا (اس کی)، کا مرکب ہے۔

کلمہ "بَقْلٌ" (جو عبارت میں مجرور اور خفیف ہے) کا مادہ "ب ق ل" اور وزن "فَعْلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "بقَل یبقُل بقلًا" (نصر سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں "ظاہر ہونا" اور یہ بھی "اگنا" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً "بقَل البقلُ" کے معنی ہیں "سبزی اگی یا ظاہر ہوئی"۔ اور بقَل وجہُ الغلامِ" کا مطلب ہے "لڑکے کا چہرہ "سبزہ" والا ہو گیا" یعنی داڑھی مونچھ کے

© rasailojaraid
© rasailojaraid

بالا ظاہر ہوتے "۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے کسی قسم کے فعل کا کوئی صیغہ استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ اس مادہ سے صرف یہی ایک لفظ "بقل" بھی صرف اسی ایک جگہ (البقرہ: ۶۱) آیا ہے۔

- لفظ "بقل" کے معنی "سبزی" ہیں۔ اور چھوٹی جڑی بوٹیوں کو بھی بعض دفعہ "بقل" کہہ دیتے ہیں۔ اور اس سے مراد وہ "بوٹیاں" یا "پودے" ہیں جن کے پتے اور شاخیں وغیرہ انسان اپنی خوراک کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے بیشتر مترجمین نے اس کا ترجمہ "ساگ" کیا ہے۔ اور بعض نے "ترکاری" کیا ہے۔ اس طرح اس پورے مرکب جاری "من بقلها" کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے "اس (زمین) کے ساگ میں سے"۔ اور یہاں "من" دراصل بیانیہ ہے یعنی اس عبارت میں "ما تنبت الارض" (جو زمین اگاتی ہے) کی وضاحت کی گئی ہے کہ وہ کون سی چیزیں ہیں)۔ اس لیے یہاں "من" کا ترجمہ "از قسم ۔۔۔" بھی ہو سکتا ہے یا جیسے کہ ۔۔۔" کے ساتھ بھی۔ اور چونکہ آگے جن چیزوں کا ذکر ہے وہ سب کی سب ضمیر (ها) کی طرف مضاف ہو کر آئی ہیں (بقلها، قثائها، فومها وعدسها، بصلها) اس لیے بعض نے "زمین کا ساگ" زمین کی ۔۔۔" وغیرہ سے ترجمہ کیا ہے۔ بعض نے اردو محاورے کو ملحوظ رکھتے ہوئے "ہوا" لگا کر ترجمہ کیا ہے یعنی "ساگ ہوا، ککڑی ہوئی ۔۔۔ ہوا" وغیرہ کی صورت میں۔

۲:۳۹:۱(۵) [وَقِثَّائِهَا] یہ "وَ" (عاطفہ بمعنی اور) + "قثاء" (جس پر ابھی بات ہوگی) + "ها" (اس کی) کا مرکب ہے۔

کلمہ "قثّاء" (جو عبارت میں مجرور اور خفیف ہے) کا مادہ "ق ث ء" اور وزن "فِعّال" ہے۔ یہ لفظ بعض دفعہ "ق" کے ضمہ (ــُـ) کے ساتھ یعنی "قُثّاءٌ" بھی بولا جاتا ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد استعمال ہی نہیں ہوتا بلکہ مزید فیہ کے بھی صرف بابِ افعال سے فعل آتا ہے مثلاً کہتے ہیں "اَقثَأَت الارضُ" یا "اَقثَأَ المکانُ" اور اس کے معنی ہیں "(اس) جگہ یا زمین میں "قثاء" بکثرت ہوئی"۔ تاہم قرآن کریم میں اس سے کوئی فعل کہیں بھی نہیں آیا۔

- لفظ "قِثّاء" کے معنی ہیں "ککڑی" اور عام مترجمین نے یہی لفظ اختیار کیا ہے (پنجابی میں اسے "ترہ" کہتے ہیں)۔ یہ (قثاء) اسم جنس ہے جب کسی ایک ککڑی کی بات ہو رہی ہو تو اس پر تائے وحدت لگا کر "قِثّاءَۃٌ" کہیں گے۔ یہ لفظ (قثاء) بھی قرآن کریم میں صرف ایک دفعہ اسی جگہ آیا ہے۔ "وقثائها" کا مطلب ہے "اس کی ککڑی" یعنی "زمین سے اگنے والی ککڑی"۔

© rasailojaraid.com

۲ : ۳۹ : ۱ (۶) [وفُوْمِهَا] و (اور) + فوم + ها (اس کی) کا مرکب ہے لفظ "فُوْم" (جو عبارت میں مجرور اور خفیف ہے) کا مادہ "ف و م" اور وزن "فُعْلٌ" ہے اس مادہ سے بھی کوئی فعل مجرد استعمال نہیں ہوتا بلکہ مزید فیہ کے بھی صرف باب تفعیل سے "روٹی پکانا" (اختبَاز) کے معنی میں آتا ہے اور وہ بھی بہت قدیم اور متروک استعمال ہے۔ قرآن کریم میں اس سے کسی قسم کا صیغہ فعل کہیں بھی نہیں آیا۔ بلکہ اس مادہ سے یہی لفظ (فوم) صرف اسی جگہ ایک ہی دفعہ آیا ہے۔

● لفظ "فوم" کے متعدد معنی بتائے گئے ہیں مثلاً (۱) لہسن (۲) گندم (۳) چنا اور (۴) "اناج" یعنی تمام اجناس خوردنی کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہاں زیر مطالعہ آیت میں اردو مترجمین نے اس کا ترجمہ "گیہوں" ہی کیا ہے۔ فارسی تراجم میں "سیر" یعنی لہسن اختیار کیا گیا ہے۔ انگریزی والوں نے "CORN" ہی لیا ہے جو دانۂ گندم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس سے لہسن والے معنی کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ابن مسعودؓ کی قراءت میں اسے "ثُوم" بھی پڑھا گیا ہے اور "ثوم" عربی میں لہسن ہی کو کہتے ہیں۔ گویا اس قراءت سے معنی کا تعین ہو سکتا ہے۔ لفظ "فوم" بھی اسم جنس ہے۔ لہسن کی ایک پوتھی یا گندم وغیرہ کے ایک دانہ کو "فُومَة" کہتے ہیں۔ "وفومها" یعنی اس زمین کا اُگایا ہوا "فوم"

© rasailojaraid.c

۲ : ۳۹ : ۱ (ے) [وعدسها] "وَ" عاطفہ اور ضمیر "ھا" کے علاوہ اس مرکب کا لفظ "عَدَس" (یہ بھی عبارت میں مجرور اور خفیف ہے) ہے۔ اس کا مادہ "ع د س" اور وزن "فَعَلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "عدَس یعدِس عَدْسًا" (باب ضرب سے) آتا ہے اور اس کے معنی "جانا، چلے جانا" ہوتے ہیں مثلاً کہتے ہیں "عدَس فی الارض" (زمین میں دور چلا گیا)۔ اور یہ بطور فعل متعدی "خدمت کرنا" کے معنی بھی دیتا ہے مثلاً "عدس فلانًا" (اس نے فلاں کی خدمت کی)۔ اور بصورتِ مجہول "عدسہ (جو ایک مہلک بیماری ہے) میں مبتلا ہونا" کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں۔ "عُدِس فلانٌ" (فلاں کو "عدسہ" ہو گیا) تاہم قرآن کریم میں اس سے کسی معنی میں بھی کوئی صیغہ فعل کہیں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ اس مادہ سے صرف یہی ایک لفظ (عدس) اسی (زیر مطالعہ) ایک جگہ آیا ہے۔ اس لفظ کا اردو ترجمہ "مسور" ہے جو بصورتِ دال یا سالم سالن کے لیے پکایا جاتا ہے۔ یہ بھی اسم جنس ہے۔ مسور کے ایک دانہ یا چند دانوں کی بات ہو تو تائے وحدت لگا کر "عدسة" بولتے ہیں۔ عینک کے شیشے (ایک خاص قسم) کو بھی "عدسہ" کہتے ہیں کیونکہ وہ مسور کے دانے کی طرح

© rasailojaraid.c

درمیان سے موٹا اور پتلے کناروں والا ہوتا ہے جسے انگریزی میں "LENS" کہتے ہیں جو "عدسة" (مسور) کا لفظی لاطینی ترجمہ ہے۔

"وعدسِھا" کا مطلب بھی "اس (زمین) کے (اگائے ہوئے) مسور" ہے۔

۲ : ۳۹ : ۱ (۸) [وَبَصَلِھَا] یہاں بھی ابتدائی "و" عاطفہ (بمعنی اور) ہے اور آخر پر ضمیر مجرور "ھا" (بمعنی اس کا / کی) ہے۔ درمیان والے لفظ "بَصَل" کا مادہ "ب ص ل" اور وزن "فَعَلٌ" ہے (عبارت میں "بصل" مجرور اور خفیف ہے جس کی وجہ "الاعراب" میں بیان ہوگی)

● اس مادہ سے فعل مجرد استعمال ہی نہیں ہوتا۔ مزید فیہ کے باب تفعیل سے فعل "کپڑے اتار لینا" کے معنی دیتا ہے مثلاً کہتے ہیں "بَصَّلہ من ثیابہ" (اس نے اس کے کپڑے اتروا دیئے) اور باب تفعّل سے بھی فعل ان مذکورہ (کپڑے اتروانا کے) معنوں کے علاوہ "کسی چیز کے چھلکے پیاز کی طرح اتارنے" کے معنی بھی رکھتا ہے مثلاً "تبصّل الشیئُ" (اس چیز کے چھلکے تہ بہ تہ تھے)۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے کسی قسم کا فعل کہیں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ اس مادہ سے بھی (گزشتہ الفاظ "بقل، فوم، قثاء اور عدس" کی طرح) صرف یہی ایک لفظ (بصل) صرف اسی ایک جگہ آیا ہے۔

● "بَصَلٌ" عربی میں "پیاز" کو کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں سندھی میں اب تک پیاز کو "بصر" ہی کہا جاتا ہے اور پنجابی کا لفظ "وَصَل" بھی اسی کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور یہ "بصل" بمعنی اسم جنس ہے۔ پیاز کے ایک یا چند دانوں (گنڈوں) کی بات ہو تو اسے "بَصلۃ" ہی کہیں گے۔ "وبصلِھا" کا ترجمہ "اور اس (زمین) کے (اُگے ہوئے) پیاز" ہوگا۔

۲ : ۳۹ : ۱ (۹) [قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ] "قال" (بمعنی "اس نے کہا") جس کا مادہ "ق و ل" اور وزن اصلی "فَعَلَ" ہے، کے مادہ، باب اور معنی و استعمال بلکہ اس کی تعلیل صرفی پر بھی پہلی دفعہ البقرہ : ۸ [۲ : ۷ : ۱ (۵)] اور اس کے بعد البقرہ : ۳۰ [۲ : ۲۲ : ۱ (۱)] میں بات ہوئی تھی۔

"اَتَسْتَبْدِلُوْنَ" کا ابتدائی ہمزہ (أ) استفہام کا (بمعنی "کیا") ہے۔ اور "تستبدلون" کا مادہ "ب د ل" اور وزن "تَسْتَفْعِلُوْنَ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد کا باب، معنی وغیرہ البقرہ : ۵۹ [۲ : ۳۷ : ۱ (۹)] میں بیان ہو چکے ہیں۔

● زیر مطالعہ لفظ (تستبدلون) اس مادہ سے باب استفعال کے فعل مضارع کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے اور اس باب سے فعل "اِسْتَبْدَلَ یَسْتَبْدِلُ اِسْتِبْدَالًا" کے معنی ہیں: "کسی چیز کو دوسری چیز

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

سے بدل لینا یا تبدیل کر لینا" یعنی "ایک شے دے کر دوسری لے لینا" ("بدل" اور "تبدیل" عربی لفظ ہیں جو اپنے اصل معنی کے ساتھ اردو میں بھی مستعمل ہیں)۔ اس فعل کا استعمال تین طرح ہوتا ہے (۱) جو چیز بدل کر "لی" جائے وہ اس فعل کے ساتھ مفعول بنفسہٖ ہو کر (براہِ راست) مذکور ہوتی ہے اور جو چیز بدلے میں "دی" جائے اس پر باء (ب) کا صلہ لگتا ہے مثلاً کہتے ہیں: "استبدل الشیئَ بکذا" (اس نے چیز دے کر وہ (فلاں چیز) لے لی) (۲) کبھی "باء" (ب) کے صلہ کی بجائے دوسری (دی جانے یا چھوڑے جانے والی) چیز پر لفظ "مکان" (کی جگہ) بطور ظرف منصوب اور مضاف ہو کر لگتا ہے مثلاً کہیں گے: "استبدل الشیئَ مکانَ کذا" (اس نے وہ چیز دے کر اس کی جگہ فلاں چیز لے لی یا بدل لی)۔ اور (۳) بعض دفعہ دوسری چیز (جس کا "بِ" یا "مکانَ" کے ساتھ ذکر ہوتا ہے) محذوف (غیر مذکور) کر دی جاتی ہے اور جو چیز بدل کر لی یا لائی جائے صرف وہی بطور مفعول مذکور ہوتی ہے جیسے "استبدلَ الشیئَ" (اس نے چیز بدل لی یا بدل کر لے لی)۔

● قرآن کریم میں اس باب (استفعال) سے اس فعل کے مختلف صیغے چار جگہ آئے ہیں اور مذکورہ تینوں طریقوں پر استعمال ہوئے ہیں۔ زیر مطالعہ عبارت "أتستبدلون" کا ترجمہ "کیا تم بدل کر لیتے/ لینا چاہتے ہو" ہے، جسے بعض نے "کیا تم عوض میں لینا چاہتے ہو۔ تم بدلے میں لینا چاہتے ہو، کیا تم بدلے میں مانگتے ہو" سے ترجمہ کیا ہے۔ "مانگتے ہو" والا ترجمہ لفظ سے تو ہٹ کر ہے مگر ان لوگوں کے "مطالبہ" کی روشنی میں بلحاظ محاورہ بالکل درست ہے۔ اسی طرح بعض نے اس کا ترجمہ صرف "کیا تم چاہتے ہو" کیا ہے جو بلحاظ مفہوم ہی درست کہا جا سکتا ہے۔

۲:۳۹:۱ (۱۰) [اَلَّذِیْ ھُوَ اَدْنٰی] یہ "الذی" (اس کو جو کہ) + "ھُوَ" (وہ ہے) + "اَدْنٰی" (جس پر ابھی بات ہو گی) کا مرکب ہے۔ لفظ "اَدْنٰی" کا مادہ "د ن و" اور وزن اصلی "اَفْعَلُ" (غیر منصرف) ہے۔ اصلی شکل "اَدْنَوُ" تھی جس میں "واو متحرکہ ماقبل مفتوح الف (مقصورہ) میں بدل جاتی ہے جو بصورت "ی" لکھا جاتا ہے (عربی میں "ادنا" لکھنا غلط ہے یہ انجمن ترقی اردو والوں کی سرکاری املاء ہے)

● اس مادہ (د ن و) سے فعل مجرد دو طرح آتا ہے (۱) "دَنَا یدنُو (دراصل دنَوَ یدنُوُ) دُنُوًّا" (باب نصر سے) آئے تو اس کے معنی ہیں: "نزدیک ہونا۔ قریب ہونا"۔ یہ فعل لازم ہے مگر جس شخص یا چیز یا جگہ وغیرہ سے نزدیک ہونے کا ذکر کرنا ہو تو اس پر "مِن" یا "اِلٰی" یا "لام" (لِ) کا صلہ لگتا ہے مثلاً کہتے ہیں: "دنا مِنہ / والیہ / ولہ" (وہ اس کے نزدیک ہوا)۔ (۲) دَنِیَ یَدْنٰی (دراصل دنِوَ یدنَوُ۔ [illegible] بدل کر لکھا اور بولا جاتا ہے رضِیَ یرضَی کی طرح) دَنَایَۃً (باب سمع

© rasailojaraid.co
© rasailojaraid.co

سے) آئے تو اس کے معنی ہیں: "گھٹیا اور حقیر ہونا یا ہوجانا"۔ اسی سے صفت مشبہ "دَنِیٌّ" (بروزن فَعِیْلٌ) آتی ہے جس کے معنی "گھٹیا، کم درجے کا، جس میں کچھ بھلائی نہ ہو" ہوتے ہیں۔ دراصل یہ مہموز اللام مادہ "دن ء" کے سے معنی رکھتا ہے جس سے فعل مجرد "دَنَأَ یَدْنَأُ دَنَاءَةً" (فتح سے) کے معنی بھی یہی (گھٹیا ہونا) ہوتے ہیں۔ البتہ یہ مہموز والا مادہ قرآن کریم میں نہیں آیا۔

● قرآن کریم میں اس زیر مطالعہ مادہ (دن و) سے صرف پہلی صورت والے فعل مجرد (نصر والا) سے ایک ہی صیغہ ایک جگہ (النجم: ۸) آیا ہے۔ اور مزید فیہ کے بابِ اِفعال سے بھی ایک ہی صیغہ ایک جگہ آیا ہے (الاحزاب: ۵۹)۔ البتہ اس مادہ سے اور اس کے فعل مجرد سے مشتق اسماء (معرفہ نکرہ مختلف صورتوں میں) ۱۳۲ جگہ آئے ہیں

● زیر مطالعہ کلمہ (اَدْنیٰ) اس مادہ (دنو) کے فعل مجرد سے (چاہے جس باب سے سمجھ لیں) اَفْعَلُ [illegible] دونوں ابواب (مذکورہ بالا) سے اس کا صیغہ مؤنث "فُعْلیٰ" کے وزن پر "دُنْیَا" بنتا ہے جس کی املاء "دنیا" رائج ہے۔ "ادنیٰ" کی جمع عموماً سالم "اَدْنَوْنَ" آتی ہے اگرچہ اس سے جمع مکسر اَدَانٍ (بروزن اَفَاعِلُ) بھی آتی ہے اور مؤنث (دنیا) کی جمع مکسر "دُنیً" (بروزن "فُعَلٌ") بھی آتی ہے۔ قرآن کریم میں اس لفظ سے (مذکر یا مؤنث کسی سے بھی) جمع استعمال نہیں ہوئی۔

● اب اگر اس لفظ (ادنی) کو باب نصر والے فعل (دنا یدنو) سے لیا جائے تو اس کے معنی "سب سے زیادہ نزدیک ، نزدیک ترین" (دنیاوی زندگی کے فوائد کے لحاظ سے) ہوں گے۔ اور اگر اسے (ادنی کو) باب سمع والے فعل سے سمجھا جائے تو اس کے معنی "سب سے گھٹیا یا بے قدر و قیمت یعنی معمولی سا" ہوں گے۔

قرآن کریم میں یہ لفظ (ادنی) مندرجہ بالا دونوں ہی معنوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کے ۱۲ جگہ آنے والے صیغوں میں سے کم از کم دو جگہ یہ "گھٹیا اور حقیر" والے معنی میں آیا ہے اور باقی مقامات پر یہ "زیادہ قریب" والے معنی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

● یہاں زیر مطالعہ عبارت میں بھی یہ لفظ اسی (گھٹیا اور حقیر والے) معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس طرح "الذی ھو ادنی" (زیر مطالعہ جملہ) کا ترجمہ بنتا ہے: "وہ چیز جو کہ گھٹیا یا حقیر ہے"۔ اور اسی ترجمہ کو بیشتر حضرات نے "وہ جو ادنیٰ ہے، وہ جو ناقص ہے، جو ادنیٰ درجہ کی ہے" کی شکل دی ہے۔ بعض [illegible] "ھو" کا ترجمہ نظر انداز کرتے ہوئے صرف "ادنیٰ چیز، گھٹیا

© rasailojaraid.co

چیز" سے ترجمہ کر دیا ہے۔ جب کہ بعض نے بلا وجہ (یا بہت سی اشیاء کے مطالبہ والے مضمون کی بناء پر) جمع کے ساتھ ترجمہ کیا ہے یعنی "ناقص چیزیں" یا "ادنیٰ درجہ کی چیزیں" کی صورت میں۔

[بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ] یہ چار کلمات یعنی "ب" (کی بجائے/ کے عوض/ کے بدلے میں/ کو چھوڑ کر) + "الذی" (وہ جو کہ/ اس کو جو کہ) + "ھُوَ" (وہ ہے) + "خَیْرٌ" (زیادہ اچھی/ بہتر/ عمدہ) کا مرکب ہے۔

اگر دیکھنا چاہیں تو "باء الجر (ب)" کے معانی و استعمال کے لیے البقرہ: ۴۵ [۲: ۳۰: ۱(۱)] اور "الذی" کے لیے الفاتحہ: ۷ [۱: ۶: ۱(۱)] اور کلمہ "خَیْرٌ" کے مادہ، وزن، باب فعل اور معنی وغیرہ کے لیے البقرہ: ۵۴ [۲: ۳۴: ۱(۵)] دیکھ لیجئے۔

- اس طرح اس حصہ عبارت (بالذی ھو خیر) کا ترجمہ "بدلے اس چیز کے جو بہتر ہے" بنتا ہے جسے بعض نے وضاحتی ترجمہ کی صورت دی ہے یعنی "اس کے بدلے میں جو زیادہ بہتر ہے"۔ "ایسی چیز کے مقابلے میں جو اعلیٰ درجہ کی ہے"۔ اور "اس چیز کے مقابلے میں جو بہتر ہے" کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ بعض مترجمین نے "الذی" اور "ھو" کا ترجمہ (اردو محاورے کی بناء پر) نظر انداز کرتے ہوئے "بڑھیا (اعلیٰ) چیز کے بدلے، بہتر کے بدلے میں" کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ خیال رہے ان تمام تراجم میں "بِ" وہی ہے جو فعل "استبدل" کے ساتھ متروک (چھوڑی ہوئی چیز) پر استعمال ہوتی ہے۔ دیکھئے [۲: ۳۹: ۱(۹)]

۲: ۳۹: ۱(۱۱) [اِهْبِطُوْا] کا مادہ "ہ ب ط" اور وزن "اِفْعِلُوْا" ہے یعنی یہ اس مادہ سے فعل مجرد کے فعل امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد (ھَبَطَ یھبط = اترنا) کے باب، معنی وغیرہ کی وضاحت البقرہ: ۳۶ [۲: ۲۶: ۱(۷)] میں کی جا چکی ہے۔

یہاں "اھبطوا" کا ترجمہ بطور فعل لازم "تم اترو"، "(جاکر) اترو" اور "اتر پڑو" سے کیا گیا ہے جس میں مفہوم "جاکر رہو، ڈیرہ لگاؤ" کا ہے۔ فعل "ھَبَطَ یَھْبِطُ" کے بنیادی معنی تو (جیسا کہ [۲: ۲۶: ۱(۷)] میں بیان ہوا) "بلندی (پہاڑ وغیرہ) سے نیچے اترنے" کے ہیں۔ تاہم یہ فعل بعض دفعہ "نَزَل" (یعنی کسی جگہ پڑاؤ کرنا" اور "انتقل" (ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جانا) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور زیر مطالعہ آیت میں اس کے یہی آخری معنی زیادہ موزوں ہیں۔

۲: ۳۹: ۱(۱۲) [مِصْرًا] کا مادہ "م ص ر" اور وزن "فِعْلًا" (بصورت منصوب) ہے۔ اس ثلاثی مادہ سے فعل مجرد "مصَر ... یمصُر مَصْرًا" (نصر سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں، "بکری یا اونٹنی کا دودھ صرف انگلیوں یعنی صرف انگوٹھے اور اس کے ساتھ والی انگلی (سبابہ) سے نکالنا" مثلاً کہتے

© rasailojaraid.com

ہیں "مَصَرَ النّاقۃَ" (اسے پنجابی میں "پلَکنا" کہتے ہیں) لیکن اس معنی کے لیے یہ فعل (مجرد) قریباً
متروک الاستعمال ہے۔ اس لیے بعض معاجم (ڈکشنریوں) میں اس کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا
گیا۔ البتہ مزید فیہ کے بعض ابواب (مثلاً تفعیل اور تفعّل) سے "کسی جگہ کی حدود مقرر کرنا" یا "کوئی شہر
بسانا" کے معنی میں فعل آتے ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے کسی قسم کا کوئی فعل کہیں استعمال نہیں ہوا۔

● "مِصْر" (جو اس مادہ سے ماخوذ ایک اسم ہے) کے بنیادی معنی "دو چیزوں کے درمیان ایک
حدِ فاصل" کے ہیں۔ اور "مِصْر" عموماً کسی شہر یا قصبہ کو کہتے ہیں جس میں تھانہ عدالت موجود ہو اور
حدود اللہ کے نفاذ کا بندوبست ہو۔ ابتدائی اسلامی تاریخ میں یہ لفظ "صوبائی صدر مقام" کے معنی
میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ اور اس کی جمع مکسر "اَمْصَار" ہے۔ اور بصورت تثنیہ (مِصْران)
[illegible] کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ جب یہ لفظ ملک مصر کے لیے آئے تو یہ غیر
کسی شہر کے معنی میں ہو تو معرب ہوتا ہے (جیسے یہاں
منصرف (مِصْرٌ۔ مِصْرًا) ہوتا ہے۔ اور جب
بمعنی شہر تو صرف اسی ایک (زیر مطالعہ) جگہ آیا ہے اور مصر (بمعنی ملک
ہے) قرآن کریم میں لفظ مصر
مصر) چار جگہ آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں "مِصْرًا" کا ترجمہ "کسی شہر (میں)" سے کیا گیا ہے۔ ایک
صاحب نے اس کا ترجمہ "مصر" ہی کر دیا ہے جو عبارت اور "تاریخ" دونوں کے لحاظ سے درست
نہیں ہے۔

[فَإِنَّ لَكُمْ] یہ چار کلمات یعنی "فاء (فَ) (بمعنی پس، چنانچہ) + "اِنَّ" (بے شک + لام الجر
(لِ) "بمعنی" کے لیے" + "کُمْ" (تمہارے) کا مرکب ہے۔ یہ کلمات پہلے بھی کئی دفعہ گزر چکے ہیں۔ اگر
آپ چاہیں تو "فا (فَ)" کے لیے البقرہ: ۲۲ [۲: ۱۶: ۱(۱۰)] "اِنَّ" کے لیے البقرہ: ۶
[۲: ۵: ۱(۱۱)] اور "لام" (لِ) کے لیے الفاتحہ: ۲ [۱: ۲: ۱(۴)] دیکھ لیجئے۔ "کُمْ" تو ضمیر مجرور ہے۔

● اس طرح یہاں اس عبارت (فَإِنَّ لَكُمْ) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "پس تحقیق (یقیناً) تمہارے لیے
ہے"۔ اور اسی مفہوم کو بامحاورہ عبارت میں "تو تم کو ملے گا" "(وہاں) تمہیں ملے گا" "(وہاں) مل جائے
گا تم کو" سے ظاہر کیا گیا ہے۔ یہاں "مل جانا" کے ساتھ ترجمہ اس لیے موزوں ہے کہ یہ ان کے
بعض چیزوں کے مطالبہ کرنے کے جواب میں کہا گیا ہے۔ یعنی ایک طرح سے یہ تفسیری ترجمہ
ہے "یعنی جو مانگتے ہو مل جائے گا" بلکہ اسی "مانگنے" کا ذکر اگلی عبارت میں ہے۔

[مَا سَأَلْتُمْ] "مَا" اسم موصول (بمعنی "وہ جو کہ، جو کچھ کہ") ہے اس (مَا) کے معنی و
استعمال پر البقرہ: ۳ [۲: ۲: ۱(۵)] میں نیز البقرہ: ۲۶ [۲: ۱۹: ۱(۲)] میں بات ہو چکی ہے۔
[۲: ۳۹: ۱(۱۳)]

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

اور "سَأَلْتُمْ" کا مادہ "س ء ل" اور وزن "فعلتم" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "سَأَلَ ... یَسْأَلُ سُؤَالاً" (فتح سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں: ..... سے (کوئی چیز) مانگنا" اور چونکہ اس کا مصدر "سُؤَال" اردو میں بصورت "سَوَال" مستعمل ہے اس لیے اس کا ترجمہ "سوال کرنا" بھی ہو سکتا ہے۔ محاوراتی استعمال میں یہ فعل "دریافت کرنا، پوچھنا، جواب مانگنا، باز پرس کرنا اور طلب کرنا" کے معنی دیتا ہے۔ اور قرآن کریم میں یہ فعل ان (مذکورہ بالا) سب معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ قرآن کریم میں اس فعل (سأل یسأل) سے مختلف صیغے (ماضی، مضارع، امر، نہی، معروف مجہول وغیرہ) ۱۰۶ جگہ آئے ہیں۔ مزید فیہ کے باب تفاعل سے کچھ صیغے آٹھ جگہ آئے ہیں اور مصادر و اسماء مشتقہ ۴۰ جگہ آئے ہیں۔

● "سأل یسأل" ہمیشہ بطور فعل متعدی استعمال ہوتا ہے۔ جب یہ "مانگنا اور طلب کرنا" کے معنی میں آئے تو اس کے دو مفعول ہوتے ہیں (۱) جس سے مانگا جائے (۲) اور جو چیز مانگی جائے اور دونوں بنفسہٖ (بغیر صلہ کے) منصوب ہو کر آتے ہیں جیسے "من لا یسألکم اجرًا" (یٰس : ۲۱) یعنی جو تم سے کچھ اجر نہیں مانگتا" یا "لا نسألک رزقًا" (طٰہٰ : ۱۳۲) یعنی "ہم تجھ سے کوئی روزی نہیں مانگتے"۔ بعض دفعہ دوسرا مفعول محذوف بھی کر دیا جاتا ہے جیسے "لا یسألون الناس" (البقرۃ : ۲۷۳) میں یہ مذکور نہیں کہ وہ لوگوں سے کیا نہیں مانگتے۔ جو سیاقِ عبارت سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اور کبھی دوسرے مفعول پر "من" (بیان یا تبعیض کے لیے) لگتا ہے جیسے "وَاسْأَلُوا اللهَ مِنْ فَضْلِهِ" (النساء : ۳۲) میں "فضلَہ" کو "من فضلہ" کر دیا گیا ہے۔

● اور اگر "سأل" "پوچھنا (یعنی جواب مانگنا)، دریافت کرنا" یا "باز پرس کرنا" کے معنی میں استعمال ہو تو بھی اس کے مفعول تو دو ہی آتے ہیں (۱) ایک وہ جس سے پوچھا جائے (۲) دوسرا وہ جس کے بارے میں پوچھا جائے۔ اس صورت میں پہلا مفعول تو بنفسہٖ آتا ہے اور دوسرے مفعول پر "عَنْ" کا صلہ لگتا ہے۔ جیسے "یسألونک عَنِ السّاعۃ" (الاعراف : ۱۸۷) یعنی "وہ تجھ سے پوچھتے ہیں قیامت کے بارے میں"۔ اور کبھی "عن" کی بجائے (دوسرے مفعول پر) "بِ" کا صلہ لگتا ہے جیسے "فَسْئَلْ (فاسأل) بہ خبیرًا" (فاطر : ۵۹) یعنی "اس کے بارے میں کسی باخبر سے پوچھ"۔ اور بعض دفعہ پہلا مفعول حذف کر دیا جاتا ہے صرف دوسرا مذکور ہوتا ہے جیسے "سأل سائل بعذاب" (المعارج : ۱) یعنی "ایک پوچھنے والے نے عذاب کے بارے میں پوچھا"۔ یہاں "کس سے پوچھا" مذکور نہیں ہے۔

(باقی صفحہ ۸ پر)

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com